اسلامی تہذیب کی تشکیل میں شیعوں کا کردار

سید رمیز الحسن موسوی*
srhm2000@yahoo.com

کلیدی کلمات: تہذیب وتمدن،،مدنیت، شیعہ، تشیع،، فاطمی، آل بویہ، تفسیر، فقہ، تحریک ترجمہ۔

خلاصہ:

اکثر مسلمان موٴرخین نے اپنے سیاسی اور مسلکی مفادات کے پیش نظر اسلامی تہذیب کی تشکیل اہل تشیع کے تاریخی کردار کو درست بیان نہیں کیا۔ انہوں نے اسلامی تہذیب کی تشکیل کا کارنامہ فقط خلفائے کرام اور چند مسلمان حکمرانوں کے نام لکھا۔ حالانکہ تاریخ کے گہرے مطالعہ سے ایسے واضح نشانات ملتے ہیں جو اسلامی تہذیب کی تشکیل میں ائمہؑ اہل بیتؑ اور اُن کے پیروکاروں (امامیہ اثناء عشریہ، زیدیہ، اسماعیلیہ) کے کردار کو نمایاں کرتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی تہذیب کی تشکیل میں حضرت امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہاالسلام اور آپ کے شاگردوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ مختلف علوم ومعارف کسی بھی تہذیب وتمدن کی اساس شمار ہوتے ہیں۔ اسلامی تہذیب میں تفسیر، فقہ، فلسفہ وکلام، حدیث وغیرہ جیسے اسلامی علوم کی آبیاری میں ان ہستیوں کا کردار، اسلامی تاریخ تہذیب وتمدن کی تشکیل کا ایک ناقابل انکار باب ہیں۔ اس مقالہ میں ائمہؑ اہل بیتؑ اور اُن کے شیعوں کے اسی کردار کو اجاگر کیا گیا ہے۔

تمہید عموماً اسلامی تاریخ کے موٴرخین نے حکمرانوں کے زیر تسلط ہونے کی وجہ سے شیعہ امامیہ کے تاریخی کردار کو اُس طرح پیش نہیں کیا جس طرح اُن کا حق تھا اور آج اسلامی تہذیب وتمدن کی تشکیل میں مسلمان خلفاء اور حکمرانوں ہی کو پیش کیا جاتا ہے اور ائمہ اہل بیت اطہار علیہم السلام کا علمی اور معنوی کردار اُسی تعصب کا نشانہ بن جاتا ہے جس کی بنیاد اُموی اور عباسی حکمرانوں نے رکھی تھی۔ لیکن اس کے باوجود تاریخ کے گہرے مطالعہ سے بہت سے ایسے واضح نشانات ملتے ہیں جو اسلامی تہذیب میں اہل بیت اطہارؑ اور اُن کے پیروکاروں کے نقش قدم کو نمایاں طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس مقالے میں انہی نقوش کو نمایاں کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

تہذیب وتمدن کی تعریف

اس سے پہلے کہ ہم اصل موضوع کی طرف آئیں، خود کلمہ ''تہذیب وتمدن'' کی تعریف وتوصیف کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ قاری کو اس تحریر میں اس کلمے کے استعمال کا ادراک ہوسکے۔

---

* ۔ مدیر مجلّہ سہ ماہی "نور معرفت" نور الہدیٰ مرکز تحقیقات (نمت)، بھارہ کہو، اسلام آباد۔

تہذیب کو انگریزی میں سویلائزیشن اور عربی وفارسی میں تمدن کہتے ہیں ۔ تہذیب ایک ایسا گہوارہ ہے جس میں انسانیت پروان چڑھتی ہے، انسان کا تشخص قائم ہوتا ہے،اس کی شناخت ہوتی ہے، اس کے لیے ترقی کی راہیں ہموار ہوتی ہیں اور اس کو اپنا کر وہ زندگی کے مراحل طے کرتا ہے اور دوسری اقوام وملل سے ممتاز ہوتا ہے۔ ثقافت (کلچر) اور تہذیب (سویلائزیشن) کی اصطلاحات عمرانیات، تاریخ اور فلسفے کے مباحث میں استعمال ہوتی ہیں۔البتہ ان کی فنی تعریف میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے لیکن بعض اوقات ان دونوں کو مترادف بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

تمدن کے عنوان سے کتابیں لکھنے والے علماء، دانشوروں اور لغت نویسوں کے مطابق تمدن ''مدینہ'' سے مأخوذ ہے جس کا معنی ''شہر'' ہے۔ اس لحاظ سے تمدن اور مدنیت (شہر نشینی) مترادف ہیں۔لیکن اس کے اصطلاحی معنیٰ کے مطابق تہذیب وتمدن کا اطلاق انسانی زندگی کے اس مرحلے پر ہوتا ہے کہ جب انسان ترقی اور پیشرفت کرلیتا ہے اور ابزار وآلات سے استفادہ کرنے لگتا ہے۔یعنی اپنی زندگی میں تبدیلی لاتے ہوئے وہ رفاہ وآسائش حاصل کرلیتا ہے ۔ایک مغربی دانشور کے مطابق انسان اب تک تہذیب وتمدن کے تین مراحل طے کرچکا ہے:

سب سے پہلا مرحلہ وہ ہے جب انسان زراعت اور کھیتی باڑی سے آگاہ ہوتا ہے۔اس مرحلے میں انسان کھیتی باڑی اور ذخیرہ اندوزی سے آگاہ ہوتا ہے۔لہٰذا اس مرحلے میں انسان کی زندگی میں ایک تبدیلی واقع ہوتی ہے،اس کو ''زرعی تہذیب وتمدن'' کہا جاتا ہے۔

انسانی تہذیب وتمدن کا دوسرا مرحلہ وہ ہے جب انسان ''صنعت'' سے آگاہ ہوتا ہے۔اس مرحلے میں انسان صنعت وحرفت کو استعمال میں لاتا ہے اور آہن اور فولاد پر مسلط ہو جاتا ہے۔انسانی تہذیب وتمدن کا تیسرا مرحلہ ہمارے معاصر زمانے کا تمدن ہے، جسے ہم ''سائنسی تمدن'' کہتے ہیں۔اس مرحلے میں جو ملک وقوم جس قدر سائنس اور ٹیکنالوجی سے بہرہ مند ہوگی، اسی قدر دوسروں سے زیادہ پیشرفتہ اور ترقی یافتہ کہلائے گی۔اس لئے تمام ممالک کو انہی تین قسم کے تمدنوں کے لحاظ سے تین انواع میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

مادی اور معنوی تہذیب وتمدن

تہذیب وتمدن مادی بھی ہوسکتا ہے اور معنوی بھی۔مادی تمدن سے مراد صنعت، زراعت، سائنس وٹیکنالوجی ہے جس کو موجودہ دور میں سائنسی ترقی کا نام دیا جاتا ہے۔ جبکہ معنوی تمدن سے مراد انسانی معاشروں کا مسالمت آمیز زندگی سے بہرہ مند ہونا ہے۔ یہ تہذیب وتمدن کی اعلیٰ ترین قسم شمار ہوتی ہے۔ یعنی کسی معاشرے کے متمدن ہونے کے لئے یہی کافی نہیں کہ وہ صنعت اور ٹیکنالوجی سے بہرہ مند ہے (یہ بھی ایک تمدن ہے لیکن تمدن کی مطلوبہ اور آئیڈیل شکل نہیں اور نہ ہی اس سے انسان کو سعادت اور خوشبختی حاصل ہوسکتی ہے) بلکہ ایک آئیڈیل اور پسندیدہ تہذیب وتمدن وہ ہے جس میں انسان فکر وسوچ کے لحاظ سے بالغ ہو جائے اور کم از کم اس طرح زندگی گذارنے کے قابل ہو جائے کہ اُس کے ہاتھ سے کسی دوسرے انسان کو نقصان نہ پہنچے۔

یہ وہی مرحلہ ہے جس کی طرف اسلام انسانوں کو لے جانا چاہتا ہے جیساکہ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔ تہذیب وتمدن کی یہ (مادی ومعنوی) تقسیم تمدن کے لغوی معنیٰ کے ساتھ زیادہ تناسب رکھتی ہے کیونکہ "مدینہ" (شہر) کے لفظ میں تہذیب وثقافت کا وجود ضروری ہے، لیکن بَدَوی (خانہ بدوش) اور غیر مہذب معاشروں میں اس قسم کی کسی چیز کا تصور نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا جب ایک معاشرہ بدویّت سے مدنیّت کی طرف آتا ہے تو اس وقت اُسے مہذب ومتمدن کہا جاتا ہے۔

البتہ یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ تہذیب وتمدن کو ان دو معنوں میں تقسیم کرنا درست ہے اور اس کی دوسری قسم (معنوی) تمدن پہلی قسم (مادی تمدن) سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن اصطلاحاً جب تمدن کہا جاتا ہے تو زیادہ تر اس کا مادی پہلو ہی مد نظر ہوتا ہے۔ یعنی ایک ایسے معاشرے کو متمدن سمجھا جاتا ہے جو صنعتی اور سائنسی لحاظ سے ترقی یافتہ ہو۔

لہٰذا ضروری کہ اس مقالے میں تہذیب و تمدن کے ان دونوں معانی کو مد نظر رکھا جائے۔البتہ اہلِ دین و دیانت کی نظر میں صنعتی اور سائنسی تمدن ہی انسانی سعادت کے لئے کافی نہیں ہے، لیکن ممکن ہے مغربی دانشور اور دوسرے غیر دینی مکاتیب فکر اس بات کو قبول نہ کریں۔چونکہ مغربی دنیا پر حاکم قدروں کے مطابق معنوی ترقی وپیشرفت سے زیادہ مادی ترقی وپیشرفت زیادہ اہم ہے۔اسی لئے آج تک مغرب میں صنعت اور سائنس کو انسانیت کی تخریب میں استعمال کیا گیا ہے اور انسانی صلاحیتوں کو جنگی اسلحہ میں ترقی اور کمزوروں پر مسلط ہونے کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔درحقیقت اُنہوں نے علمی آزادی کو سلب کرتے ہوئے علم وسائنس کو اپنی مادی اغراض پورا کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔اس لیے ہمارے نزدیک فقط مادی تمدن ہی کافی نہیں اس کے ساتھ معنوی تہذیب و تمدن بھی ضروری ہے جس کی ہمارے دین نے بہت زیادہ تاکید کی ہے۔بہر حال گزشتہ بحث کا خلاصہ یہ کہ ہر معاشرے میں انسان کی معنوی اور مادی کوششوں کے نتیجے میں ہی تہذیب و تمدن وجود میں آتا ہے۔

اسلامی تہذیب وتمدن کا تعارف

اسلامی تہذیب و تمدن سے مراد مسلمانوں کی وہ ترقی اور پیشرفت ہے کہ جو اسلامی تعلیمات کے نتیجے میں وجود میں آئی۔اس میں وہ تمام علوم وفنون شامل ہیں جن میں مسلمانوں نے ترقی کی اور ان کے دنیا میں پھلنے پھولنے میں کردار ادا کیا۔مثلاً طب وسائنس، فلسفہ اور کلام اور دوسرے علوم وفنوں جن میں مسلمان علماء اور دانشوروں کی کوششوں کو تاریخ نے ثبت کیا ہے۔اسی طرح عظیم الشان کتابخانوں، علمی مدارس اور تاریخی عمارتوں کی تأسیس اور انسانی آسائش ور فاہ کے کاموں میں مسلمانوں نے جو کوششیں کی ہیں وہ بھی اسلامی تہذیب و تمدن کا ایک اہم حصہ ہیں۔
اسلامی تمدن کا سرچشمہ اسلامی تعلیمات اور اسلامی افکار ہیں۔پیغمبر اسلام ﷺ اور دوسرے بزرگان دین نے علم ودانش کے حصول کی تشویق پر مبنی جو فرامین اور ہدایات دی ہیں،اُنہی سے اسلامی تمدن کی بنیادیں فراہم ہوئی ہیں۔اسی طرح اغیار کے تمدن سے آشنا ہونے کے بعد اور دوسرے ممالک کے مسلمان علاقوں میں شامل ہونے کی وجہ سے اسلامی تمدن نے مزید ترقی اور پیشرفت کی ہے۔اسلامی تمدن میں علم ودانش کے حصول کے بارے میں پیغمبر اسلام ﷺ کی خصوصی توجہ کی وجہ سے اس تمدن نے دوسرے تمدنوں سے بھی اقتباس کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا اور **"حکمت مؤمن کی گمشدہ میراث ہے، اسے جہاں پاؤ حاصل کرلو"** جیسی احادیث نے مسلمانوں کو دوسرے تمدنوں سے اچھی چیزیں لینے میں مدد دی ہے۔اسلامی تہذیب و تمدن کی دوسرے تمدنوں پر فوقیت کے بارے میں آیت اللہ سید علی خامنہ ای لکھتے ہیں:

> "اسلام میں روز اول سے ہی شروع ہونے والی علمی تحریک کی برکت سے اسلامی تہذیب و تمدن کو وجود ملا۔اسلام کے ظہور کو ابھی دو صدیاں بھی نہیں گزری تھیں کہ اسلام کی برق رفتار علمی تحریک شروع ہو گئی، وہ بھی اس دور کے ماحول میں۔اگر آپ اس وقت کی علمی تحریک کا موازنہ کرنا چاہتے ہیں تو دنیا کے موجودہ علمی مراکز کو پیش نظر رکھیے اور پھر فرض کیجیے کہ کوئی ملک دنیا کے کسی دور دراز کے علاقے میں واقع ہے جو تہذیب و تمدن سے پوری طرح بے بہرہ ہے۔یہ ملک تہذیب و تمدن کے میدان میں ایک دم داخل ہو اور سو یا ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں علمی لحاظ سے تمام تہذیبوں پر فوقیت حاصل کرلے۔"(1)

شیعہ و تشیع

تاریخ اسلام میں کلمہ تشیع اور شیعہ تین معنوں میں استعمال ہوا ہے:
ا۔شیعہ اور تشیّع اپنے خاص معانی میں کہ جس سے مراد حضرت علی علیہ السلام کی خلافت بلا فصل ہے جس کے تمام امامیہ اور شیعہ فرقے قائل ہیں۔

۲۔ خلیفۂ سوم حضرت عثمان کے قتل کے بعد ایک گروہ تو اُن کا حامی باقی رہا جبکہ مسلمانوں کی اکثریت نے حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کر لی تھی۔اس اکثریت نے حضرت عثمان کی حمایت نہیں کی۔انہیں بھی شیعیان علی کہا جانے لگا اگرچہ یہ اکثریت اپنے خاص معنیٰ میں شیعہ اعتقادات نہیں رکھتی تھی اور یہ لوگ پہلے دو خلفاء کو بھی قبول کرتے تھے۔یہاں شیعہ سے مراد حضرت علیؑ کے سیاسی حامی ہیں،جو "شیعۂ عثمان" یا "عثمانیہ" (2)کے مقابلے میں "شیعۂ علی" کہلائے۔اعتقادی حوالے سے وہ شیعہ نہیں تھے لیکن سیاسی عنوان سے وہ حضرت علیؑ کو اپنا پیشوا مانتے تھے۔ انہیں ہم اصطلاحی شیعہ نہیں کہہ سکتے۔

۳۔ بطور کلی جو بھی محب اہل بیتؑ تھا تاریخ میں وہ شیعہ کے عنوان سے مشہور ہو گیا۔مثلاً بعض معتزلی علماء کہ جو اصطلاح خاص کے مطابق شیعہ نہیں تھے،لیکن از نظر علم وفضیلت حضرت علی علیہ السلام کی تفضیل کے قائل تھے،شیعۂ معتزلی کہلانے لگے۔آج بھی بہت سے محبان اہل بیتؑ ہیں جو فقہی اعتبار سے مذاہب اہل سنت کے پیروکار اور خلفاء کی خلافت کے قائل ہیں،لیکن تفضیل علیؑ کا اعتقاد رکھتے ہیں اور دشمنان علیؑ سے اظہار بیزاری کرتے ہیں۔

اس مقالے میں شیعہ سے مراد اس کا خاص معنیٰ ہے یعنی اصطلاحی شیعہ مراد ہیں جو حضرت علی علیہ السلام کو خلیفۂ بلافصل مانتے ہیں۔اور اس مقالے میں شیعی تہذیب وتمدن سے مراد بھی وہی تمدن ہے جو تمام شیعہ فرقوں (امامیہ اثنا عشریہ،زیدیہ،اسماعیلیہ) کو شامل ہے۔

معنوی تہذیب وتمدن میں شیعوں کا حصہ

مادی تمدن کے لئے مادی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے،لیکن افسوس کے ساتھ ان وسائل سے شیعہ پوری تاریخ میں محروم رہے ہیں۔اس قسم کے وسائل یا تو تھے ہی نہیں اگر تھے بھی تو بہت کم،کیونکہ مسلمان حکومتوں کے سربراہ ہمیشہ شیعیت کے سیاسی اصول مبانی سے خائف رہے ہیں اور اُنہوں نے نہ فقط شیعوں کو بلکہ ائمہ اطہار علیہم السلام کو بھی ہمیشہ سیاسی منظر سے دور رکھا ہے۔تاریخ میں شیعیان اہل بیتؑ کے ایسے ایسے مصائب ثبت ہیں کہ جن کو پڑھ کر آج بھی انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔اگر کسی علاقے میں ایک مختصر عرصے کے لئے کوئی شیعہ حکومت تشکیل پائی بھی ہے تو مادی لحاظ سے وہاں شیعہ تمدن کے اثرات واضح دیکھے جا سکتے ہیں۔مثلاً مصر میں فاطمیوں کی حکومت یا آل بویہ کی حکومت میں شیعی اسلامی تمدن کافی حد تک پھلا پھولا ہے اور اس نے بہت سے اہم کام انجام دیے ہیں۔

البتہ معنوی پہلو سے مسئلہ اس کے برعکس ہے چونکہ شیعہ اہل بیت اطہار علیہم السلام کے پیروکار تھے۔ان کے مطابق اہل بیت اطہار علیہم السلام ہی اسلامی علوم کا سرچشمہ تھے۔لہٰذا معنوی لحاظ سے شیعہ تمام اسلامی فرقوں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔مثلاً ائمہ اطہار علیہم السلام سے منقول احادیث اور روایات کی وجہ سے شیعہ ایک بہت ہی وسیع اور بلند مرتبہ معارف پر مبنی تہذیب وتمدن تشکیل دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ان احادیث اور وایات کی ایک بڑی تعداد امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے نقل ہوئی ہے۔ائمہ اطہارؑ سے منقول یہ علوم ومعارف بنی اُمیہ اور بنی عباس کے درمیان سیاسی چپقلش اور اقتدار کی منتقلی کے دوران عوام الناس میں عام ہوئے ہیں،چونکہ واقعۂ کربلا کے بعد بنی اُمیہ کے دور میں شیعوں کے چوتھے پیشوا،حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کا دور سیاسی حوالے سے انتہائی سخت دور تھا،جس میں سیاسی فعالیت تو کہاں علمی اور ثقافتی کام کرنا بھی بہت مشکل تھا۔اس دوران امام زین العابدینؑ جیسے ستم دیدہ دینی پیشوا دعاؤں کے قالب میں اسلامی معارف کو بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور دعا اور مناجات کے ذریعے لوگوں میں اسلامی تہذیب وتمدن کے بیج بونے کی سعی کرتے ہیں۔اس لحاظ سے امام زین العابدین سے منقول دعا ومناجات کا مجموعہ "صحیفہ کاملہ" ہمارے معنوی تمدن کا ایک عظیم سرمایہ شمار ہوتا ہے۔

اسی طرح امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کو جب دو سیاسی قوتوں کے درمیان سیاسی چپقلش اور اقتدار کی منتقلی کی وجہ سے جو فرصت ملتی ہے، اُس سے بھر پور فائدہ اُٹھاتے ہوئے قرآنی اور نبوی علوم و معارف کی ترویج کی زبردست مہم شروع کی جاتی ہے۔ اس دوران، ان دو ائمہ اہل بیتؑ سے منقول احادیث اور روایات ایک ایسا عظیم علمی ذخیرہ وجود میں آتا ہے جو شیعی اسلامی تمدن کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ بنابریں شیعوں نے معنوی تمدن کے لحاظ سے دوسرے اسلامی فرقوں کی نسبت بہت زیادہ ترقی کی ہے۔ جس کے اثرات جدید دور میں مزید نکھر کر ظاہر ہو رہے ہیں۔ چونکہ جس فکری امنیت اور عملی اخلاق سے شیعہ بہرہ مند ہیں اس سے دوسرے فرقے بہرہ مند نہیں ہیں اور یہ سب ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی احادیث کی برکت سے ہے۔ امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام نے اسلامی تمدن کے دونوں (مادی اور معنوی) پہلوؤں میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ مادی پہلو سے دیکھیں تو کیمسٹری کے مشہور سائنسدان جابر بن حیان جیسے شاگرد اور معنوی پہلو سے ہشام بن حکم جیسے متکلم کی پرورش انہی ہستیوں نے کی ہے۔

تاریخی شواہد سے پتا چلتا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے چار ہزار شاگرد تھے کہ جنہوں نے مختلف علوم و فنون میں امام علیہ السلام سے علم حاصل کیا ہے۔ (3) کہتے ہیں ایک شخص امام علیہ السلام کی خدمت میں مناظرے کی غرض سے آیا تو آپؑ نے علم کلام، فقہ اور لغت کے شعبوں میں سے ہر ایک شعبے کے لئے ایک شاگرد کو اس شخص سے مناظرہ کرنے کا حکم دیا۔ ([4]) یہ جو مشہور ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے چار ہزار شاگرد تھے تو اس سے یہ مراد نہیں کہ امام علیہ السلام آج کل کی طرح ایک مدرسے کی عمارت بنائی ہوئی تھی اور اس میں چار ہزار شاگرد آپؑ سے درس لے رہے تھے بلکہ مراد یہ ہے کہ چند سالوں کے دوران بہت سے افراد امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے ہیں اور آپ سے علم حاصل کرنے کے بعد اُن شمار آپؑ کے شاگردوں میں ہونے لگتا تھا۔

جیسا کہ حنفی مذہب کے بانی ابو حنیفہ کا شمار بھی امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگردوں ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس بات کا اعتراف خود ابو حنیفہ نے ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے: "لولا السّنتان لهلكَ النّعمان" اسی طرح مذہب مالکی کے امام، مالک بن انس بھی امام علیہ السلام کے شاگردوں میں سے ہیں۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے ایک محدود زمانے اور محدود علاقے میں جب بھی شیعوں کو حکومت تشکیل دینے کا موقع ملا ہے، اُنہوں نے مادی لحاظ سے بھی اسلامی تمدن کی بنیادیں مضبوط کرنے کی سعی کی ہے اور اس سلسلے میں اہم کام انجام دیئے ہیں۔ جیسا کہ مصر میں فاطمیوں کی حکومت اور ایران میں آل بویہ کی حکومت نے اسلامی تہذیب و تمدن کے لئے اہم کام کئے ہیں۔

لیکن تاریخ گواہ ہے کہ شیعہ ایک طولانی عرصے کے لئے حکومت سے کبھی بھی بہرہ مند نہیں ہوئے لیکن اُنہیں جب بھی موقع ملا ہے اور اپنی مختصر حکومتوں میں بھی اسلامی تمدن کے اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں۔ جنہیں مؤرخین نے مسلمانوں کے علمی کارناموں کے ضمن میں ذکر کیا ہے اور شیعہ حکومتوں کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ مثلاً شہر سازی، ہسپتالوں کی تعمیر و تاسیس، بند سازی، زراعت اور کھیتی باڑی میں ترقی، علمی مدارس اور علمی و دینی مراکز کی تاسیس بعض شیعی حکومتوں کی اہم کام ہیں۔

اس سلسلے میں تمام شیعہ حکومتوں خواہ وہ بغداد اور ایران میں آل بویہ ہوں یا حمدانیوں کی حکومت ہو یا مصر میں فاطمیوں کا حکومتی سلسلہ ہو، (5) ان سب نے مادی تمدن سازی میں بہت زیادہ کام انجام دیئے ہیں [6]۔ مثلاً بغداد میں ''عضدی ہسپتال'' اور شیراز میں '' بند امیر ''عضد الدولہ بیقھی اور شیعی حکومت کی یادگاریں ہیں۔ چوتھی اور پانچویں صدی میں مسلمانوں نے بند بنائے ہیں اور اسی طرح کتابخانوں اور علمی مراکز کی ترویج کے بارے میں بہت سے تاریخی شواہد ملتے ہیں۔ جس میں آل بویہ، فاطمی اور حمدانی سلسلے نے بہت زیادہ دلچسپی لی ہے۔ بعض شیعہ حکومتوں میں شیعہ حکمرانوں نے ہسپتالوں میں مریضوں کے مفت علاج معالجے کا اہتمام کیا ہوا تھا اور صاحب علم و فن لوگوں کے لئے ماہانہ وظائف مقرر کئے ہوئے تھے۔ (7)

اسلامی علوم کی پیشرفت میں شیعوں کا حصہ

اسلامی تہذیب و تمدن کی بنیادوں میں سے ایک اہم بنیاد مختلف علوم و معارف ہیں کہ جن کی وجہ سے یہ تمدن دوسرے تمدنوں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ اسلام نے کسب علم کی بہت زیادہ تاکید کی ہے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو تفسیر، فقہ، فلسفہ و کلام، حدیث وغیرہ خالص اسلامی علوم ہیں، ان میں مسلمانوں کی ترقی ہی کی وجہ سے اسلامی تمدن نے عروج حاصل کیا ہے۔ مذکورہ تمام علوم میں شیعہ سب سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ ائمہ اطہارؑ اور اُن کے پیروکار شیعوں نے اسلامی علوم و معارف کی پیش رفت میں جو نمایاں کارکردگی دکھائی ہے اُس کا مختصر جائزہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

علم تفسیر

سب سے پہلے ہم علم تفسیر کو ہی لیتے ہیں۔ علم تفسیر ایک لحاظ سے اسلام سے پہلے بھی موجود تھا جیسا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان کتب مقدس کی تفسیر کی جاتی تھی اور اُنہوں نے بھی اپنی آسمانی کتب کی شرحیں کی ہیں۔ اگرچہ یہ شرحیں مکتوب شکل میں نہیں تھیں البتہ ایک لحاظ سے ان کو بھی کتب مقدس کی تفسیر کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہاں ہماری مراد قرآن کی تفسیر ہے۔ تفسیر قرآن میں بھی شیعہ سرفہرست ہیں۔ سب سے پہلے مفسر قرآن خود امیر المؤمنین علی علیہ السلام ہیں۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"کوئی ایسی آیت نازل نہیں ہوئی کہ جس کا مجھے علم نہ ہو کہ کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور کہاں نازل ہوئی ہے۔ بتحقیق میرے اللہ نے مجھے قلب فہیم اور زبان گویا عطا فرمائی ہے"۔ (8)

اس بات کی تصریح کتب اہل سنت میں بھی ہوئی ہے۔ چنانچہ علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

ولا احفظ عن ابی بکر رضی اللہ عنہ فی التفسیر الا آثارا قلیلۃ جدا لاتکاد تجاوز العشرہ و اما علی (رضی اللہ عنہ) فروی عنہ الکثیر و قد روی معمر عن وھب بن عبداللہ عن ابی الطفیل قال شھدت علیا یخطب و ھویقول: سلونی فواللہ لاتسألون عن شئی اِلاّ اخبر لکم و سلونی عن کتاب اللہ فواللہ ما من آیۃ اِلاّ وأنا أعلمُ أبلیل نزلت أم بنھار أم فی سھل ام فی جبل۔ (9)

یعنی: "اور مجھے تو ابو بکر رضی اللہ عنہ سے تفسیر قرآن کے متعلق بہت کم روایات دستیاب ہو سکی ہیں جن کی تعداد دس سے زیادہ نہیں۔ البتہ علی (رضی اللہ عنہ) سے اس بارے میں زیادہ روایات لی گئی ہیں۔ چنانچہ معمر نے وہب بن عبداللہ سے انہوں نے ابوالطفیل سے روایت کی ہے کہ میں نے علی کو ایک خطبہ فرماتے سنا کہ پوچھ لو مجھ سے خدا کی قسم مجھ سے تم جس چیز کا سوال کروگے بتاؤں گا اور مجھ سے قرآن شریف کے متعلق پوچھو، پس اللہ کی قسم کوئی آیت ایسی نہیں جس کو میں نہ جانتا ہوں، خواہ رات میں اُتری ہو یا دن میں زمین پر نازل ہوئی ہو یا پہاڑ پر۔"

جیسا کہ کتب سیر وحدیث میں ہے کہ امام علی علیہ السلام کے بعد اُن کے شاگرد اور عظیم مفسر حضرت ابن عباسؓ نے ایک تفسیر لکھی ہے کہ جو اس وقت بھی موجود ہے اور اہل سنت بھی اُن کی تفسیری آراء کو قبول کرتے ہیں۔ ابن عباسؓ کی تفسیر کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ قرآن کے کلمات اور الفاظ کا معنیٰ کرتے وقت ایام جاہلیت کے اشعار سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ اور تفسیر کے باب میں یہ بہت اہم چیز ہے۔ مثلاً اُنہوں نے قرآن کے ہر کلمہ کی وضاحت میں لکھا ہے کہ فلاں کلمہ امرؤالقیس کے فلاں شعر میں بھی آیا ہے اور وہاں اس کا یہ معنیٰ ہے۔ دوسرے بڑے مفسرین نے بھی اُن کی تفسیر سے اقوال نقل کئے ہیں مثلاً طبری نے اُن سے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں۔

ابن عباسؓ کے بعد سعید بن جبیرؒ کہ جو مشہور شیعہ اور مفسر تھے جنہوں نے تفسیر لکھی ہے۔ان کے بعد بھی ہر صدی میں شیعوں نے تفسیر قرآن پر خصوصی توجہ دی ہے۔اور شیعہ علماء نے بہت سی تفاسیر قرآن لکھی ہیں۔ جن میں سے بعض چھپ چکی ہیں اور بعض خطی نسخوں کی صورت میں محفوظ ہیں۔بہت سے متعصب لوگوں نے شیعوں پر عظیم ظلم کیا ہے اور لکھا ہے کہ شیعوں نے قرآن پر کوئی توجہ نہیں دی حالانکہ شیعہ تفاسیر کی تعداد اہل سنت تفاسیر سے کہیں زیادہ ہے۔

علم فقہ اور حدیث

فقہ کے بارے میں بھی دیکھا جائے تو شیعہ دوسرے اسلامی فرقوں کی نسبت بہت زیادہ توفیقات سے بہرہ مند ہیں۔ائمہ اطہار بالخصوص امام باقر اور امام جعفر صادق علیہم السلام نے فقہ اہل بیت کو مدون کرنے میں بہت زیادہ کوششیں کی ہیں۔البتہ فقہ فقط علم عقلی ہی نہیں بلکہ اس میں ہم منقولات کے زیادہ محتاج ہیں۔شیعہ مکتب کی خوش نصیبی ہے عقیدۂ امامت کی بدولت انہی رسول اکرم ﷺ سے متصل کرنے والے سلسلۂ عصمت وطہارت کی وجہ سے منقولات کا ایک وسیع ذخیرہ ملا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے بعد اُن کی علمی اور روحانی وراثت کے امین بارہ ائمہ معصومینؑ نے شیعوں کے لئے زندگی کے ہر شعبے سے متعلق احادیث اور روایات کا ایک وافر ذخیرہ چھوڑا ہے،اس لئے شیعہ مکتب کے پاس فقہی احادیث کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہونے کی وجہ سے وہ ہر موضوع پر شرعی احکام کا استنباط کر سکتے ہیں اور پھر شیعوں نے دروازہ اجتہاد بھی بند نہیں کیا جس کی وجہ سے ہر دور میں مجتہدین موجود رہے ہیں اور جدید سے جدید مسائل کے حل کے لئے احکام استنباط ہوتے رہے ہیں۔افسوس کے ساتھ اہل سنت کے پاس اس قسم کے فقہی منابع نہیں چونکہ وہ فقط احادیث نبویؐ پر اکتفا کرتے ہیں جن کی تعداد شیعہ احادیث کی نسبت بہت کم ہے۔جس کی وجہ سے اہل سنت کے ائمہ فقہ کو قیاس اور استحسان جیسے ذرائع کا محتاج ہونا پڑا ہے جو ہمارے نزدیک یقین آور نہیں ہیں۔شیعہ مکتب فکر کے مطابق جو احادیث ائمہ معصومین علیہم السلام کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں،اُن کا سلسلہ روایت خود پیغمبر اکرم ﷺ تک پہنچتا ہے جو یقینی ترین سلسلہ سند ہے۔

بنابریں شیعوں کے پاس علم فقہ میں ایک عظیم سرمایہ موجود ہے جس کی بدولت وہ ایک ترقی یافتہ فقہ کی پیروی کرتے ہیں اور زمان ومکان کے لحاظ سے فقہی احکام میں اُنہیں کوئی مشکل پیش نہیں آتی اور وہ باب اجتہاد کے کھلا ہونے کی وجہ سے جدید زمانے کے تقاضوں کے مطابق شرعی زندگی گذار سکتے ہیں۔اسی طرح شیعہ فقہ میں جدید تمدن کے پیدا شدہ تمام سوالات کا جواب موجود ہے۔

اہل سنت کے ہاں ایک عرصہ دراز تک حدیث کی کتابت پر پابندی تھی۔کہتے ہیں یہ پابندی عمر بن عبدالعزیز کی حکومت تک باقی رہی ہے، لیکن شیعہ نے اس پابندی کو قبول نہیں کیا جس کی وجہ سے دوسروں کی نسبت شیعہ مکتب، پیغمبر اکرم ﷺ کی احادیث ،فرامین اور سیرت کی حفاظت کرنے میں بہت کامیاب رہا ہے۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے کہ علم تفسیر کے علاوہ علم فقہ میں بھی شیعہ اہل سنت پر مقدم ہیں۔قرآن مجید کہ جو وحی الٰہی ہے ،کے بعد سب سے پہلا فقہی مجموعہ حضرت امام علی علیہ السلام نے تدوین کیا تھا اور وہ ایک ایسا صحیفہ تھا جس کو آپؑ نے ایک جلد کی شکل میں اپنی تلوار کے ساتھ باندھا ہوتا تھا۔آپؑ سے منقول ہے کہ ہمارے پاس قرآن کے بعد اس صحیفہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔اُس صحیفہ میں دیات تک کے مسائل موجود تھے۔(10)

بعض منابع کے مطابق حضرت امام علی علیہ السلام کے بعد سب سے پہلا فقہی مجموعہ ابو رافع نے ''السّنن والاَحکام والقضایا'' کے نام سے تالیف کیا ۔ابو رافع امام علی علیہ السلام کا کاتب اور منشی تھا۔(11)ان منابع کے مطابق شیعہ علم فقہ میں بھی دوسرے فرقوں پر مقدم ہیں۔ کتابت حدیث کی ممنوعیت کہ جو تقریباً ایک سو سال تک رہی ہے، اس دوران بہت سے محدثین دنیا سے رخصت ہوگئے تھے جس کی وجہ سے وضعی احادیث کا دروازہ

کھل گیا تھااور اس سے مسلمانوں کا عظیم علمی نقصان ہوا ہے۔ لیکن یہ نقصان زیادہ تر اہل سنت ہی کا ہوا ہے، کیونکہ شیعہ، حکمرانوں کی طرف سے کتابت حدیث پر پابندی، کے پابند نہیں تھے۔ اس کے بعد امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کے دور میں ان دنوں ائمہ کے مکتب میں ایسے شاگرد پرورش پانے لگے کہ جن میں سے ہر ایک نے بہت زیادہ احادیث حفظ کر لی تھیں۔ بعض نے تیس ہزار اور بعض نے بیس ہزار احادیث۔ ان شاگردوں میں محمد بن مسلم، زرارۃ بن اعین اور جابر بن یزید جعفی کا نام قابل ذکر ہے۔ (12)

ان احادیث کا مجموعہ بعد میں شیعوں کے اصول "اربع مائۃ" کی صورت میں ظاہر ہوا، جو چار سو اصولوں پر مشتمل تھا۔ اصل سے مراد احادیث کا وہ مجموعہ ہے جو راوی نے براہ راست یا ایک واسطے کے ذریعے معصوم سے نقل کیا ہے۔ اصول "اربع مائۃ" ہی شیعوں کی کتب اربعہ کی بنیاد ہیں۔ شیعہ شروع ہی سے ممنوعیت حدیث کی تحریک کے مخالف تھے اور اسے ایک قسم کی گمراہی اور سازش قرار دیتے تھے، لہٰذا وہ کسی بھی وقت اس حکم کے پابند نہیں رہے اور ہر زمانے میں اپنی فقہی اصالت کی حفاظت کرتے رہے۔

اسلامی تمدن اور تحریک ترجمہ

فتوحات کے بعد اسلامی تمدن کا جغرافیا بہت پھیل جانے اور دوسری تہذیبوں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے اسلامی تہذیب و تمدن نے جو اثرات قبول کئے ہیں اُن میں سے ایک دوسری زبانوں سے علمی کتابوں کے عربی میں ترجمہ کرنے کی تحریک تھی۔ جس کی مختلف علل واسباب ذکر کئے جاتے ہیں۔ دوسری زبانوں سے عربی میں ترجمے کا آغاز خالد بن یزید کے زمانے میں ہوا ہے، وہ پہلا شخص تھا جس نے ریاضی کی چند کتابوں کو عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ لیکن ترجمے کی باقاعدہ تحریک عباسیوں کے زمانے میں شروع ہوئی ہے۔ جس میں فلسفہ، طب، ریاضی، نجوم حتیٰ اُمور مملکت کے بارے میں متعدد کتابوں کے ترجمے ہوئے ہیں۔

یہ تحریک مامون عباسی کے دور میں اپنے عروج کو پہنچ گئی تھی۔ اُس نے "بیت الحکمہ" کے نام سے ایک مرکز بنایا تھااور بہت سے لوگوں کو دنیا کے مختلف ممالک کی طرف بھیجا تاکہ وہ مختلف علوم وفنون کی کتابیں تلاش کرکے لائیں اور اُن کا عربی میں ترجمہ کیا جائے۔ عباسی خلفا خصوصاً مامون کی تشویق پر ضرورت سے زیادہ کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ مامون ترجمہ کرنے والوں کو کتاب کے ہم وزن سونا اُجرت میں دیتا تھا۔ لہٰذا جو بھی کتاب اسلامی ملک میں لائی جاتی، اُس کے ترجمے کی ضرورت نہ ہونے کے باوجود اُس کا ترجمہ کر دیا جاتا تھا۔

یہ کتابیں اکثر یونان، روم، ہندوستان اور ایران سے لائی گئیں تھیں۔ ترجمے کی یہ تحریک تقریباً صدی تک جاری رہی۔ اس دوران مسلمان اپنی تخلیقات کے بجائے دوسرے کے مترجم بن چکے تھے۔ ایک رائے کے مطابق لوگوں کے افکار میں رشد و ترقی پیدا ہوچکی تھی اور وہ حقائق جاننا چاہتے تھے۔ عقلی اور فکری مسائل کی یہی پیاس اُنہیں ائمہ اہل بیتؑ کی طرف لے جاسکتی تھی جن کے علم و فضل سے تمام لوگ آگاہ تھے۔ لیکن خلفا اس مسئلے سے خائف تھے اور وہ ائمہ اطہار علیہم السلام کے علم و فضل سے عامۃ الناس کو دور رکھنا چاہتے تھے، لہٰذا اس خوف کی وجہ سے اُنہوں نے دوسری زبانوں سے علمی کتابوں خصوصاً فلسفی کتب کے ترجمے کی تشویق کی تاکہ لوگوں کی علمی اور فکری پیاس کا رُخ موڑا جاسکے اور لوگ علم و معرفت کے بہانے اہل بیت اطہارؑ کی جانب رجوع نہ کریں۔ دوسری جانب یہ کام خلفائے بنی عباس کی علم دوستی کا ڈھنڈورا پیٹنے کے لئے بھی انجام پا رہا تھااور ایک تیر سے دو شکار کئے جارہے تھے۔

اسی سیاست کی وجہ سے بنی عباس بہت حد تک لوگوں کو اہل بیت اطہارؑ سے دور رکھنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ چونکہ لوگوں کی علمی پیاس اور حقیقت طلبی کی پیاس کو دوسرے علوم وفنون سے بجایا جانے لگا تھا۔ بظاہر اس کام کے دنیائے اسلام پر کچھ مثبت اثرات بھی مرتب ہوئے تھے، لیکن منفی اثرات بھی کم نہیں تھے۔ اس سلسلے میں ائمہ اطہار علیہم السلام کی جانب سے تحریک ترجمہ کہ منفی اثرات کو ختم کرنے کے لئے جو کچھ انجام پایا ہے وہ

بہت اہم ہے۔ائمہ اطہارؑ کی ہدایت اور رہنمائی کے سبب شیعہ ان حالات سے متاثر نہیں ہوئے اور اُنہوں نے اہل بیت اطہارؑ کی علمی مرجعیت کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑااور تمام تر علمی کتب کے ترجمے کے باوجود ائمہ معصومینؑ کے علم سے استفادہ کرتے رہے چونکہ اُن کو یقین کامل تھا کہ ان ذوات مقدسہ کے علم کا سرچشمہ علم نبوی اور وحی الہی ہے اور یہ علم لدنی کی حامل ہستیاں ہیں۔

لہٰذا ترجمہ شدہ علمی کتابیں ان کے علم کا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتیں۔شیعہ ہر علمی مسئلے کے بارے میں ائمہ اطہارؑ سے سوالات پوچھتے تھے اور تمام علمی ،عقیدتی ، فقہی اور سیاسی واجتماعی مسائل کے حل کے لئے انہی ہستیوں کی طرف رجوع کرتے تھے ،انہی سوالات کی برکت سے ائمہ اطہارؑ کی احادیث نے گمراہ کن افکار کا راستہ روکا اور تحریکِ ترجمہ کی وجہ سے پیدا ہونے والے شبہات وسوالات کے منفی اثرات سے اسلامی معاشرے کو نہ فقط بچایا بلکہ اُن کے گمراہ عقائد ونظریات کا مقابلہ بھی کیا۔لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ائمہ معصومین علیہم السلام ،علم کے مخالف نہیں تھے ،یعنی جو کچھ ترجمے کے ذریعے باہر سے وراد کیا جارہا تھا وہ ان سب چیزوں کے مخالف نہیں تھے ،بطور مثال ایک روایت کے مطابق امام جعفر صادق علیہ السلام نے "ارسطاطالیس " کی تعریف کی ہے اور اُسے موحّد قرار دیا ہے۔یہ بات توحید مفضل کی حدیث کے آخر میں نقل ہوئی ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ائمہ اطہار علیہم السلام زمین پر حجت خدا تھے اور معاشرے کی ہدایت کی ذمہ داری اُن کے دوش مبارک پر تھی۔بہت سے موقعوں پر اُنہوں نے لوگوں حتیٰ حُکام وقت کی ہدایت کا فریضہ انجام دیا ہے اور تمام گمراہ عقائد اور توحید کے خلاف نظریات کی اُنہوں نے نفی فرمائی ہے اور لوگوں کو ان گمراہ کن نظریات سے بچانے کی سعی کی ہے۔ تحریکِ ترجمہ بھی اُنہوں نے اپنے اسی فریضے پر عمل کیا ہے اور ترجمے کے منفی اثرات سے اسلامی معاشرے کو محفوظ رکھا ہے۔اسلامی معاشرے کو افراط وتفریط سے بچانے کے لئے ائمہ اطہارؑ نے جو اقدامات کئے ہیں ،اُن کی ایک مثال مکتب اعتزال کا مقابلہ تھا۔

معتزلہ عقل کو حد سے زیادہ اہمیت دیتے تھے اور ہر چیز کا معیار وہ عقل کو قرار دیتے تھے۔اس دوران یونانی فلسفے نے بھی مکتب اعتزال کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی کی ہے ،لیکن اس کے مقابلے میں ائمہ طاہرینؑ کی سعی تھی کہ وہ مسلمانوں کو محدود عقل پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرنے سے منع کریں۔اس دوران جو افکار ونظریات بیرونی دنیا سے اسلامی معاشروں میں داخل ہورہے تھے وہ مکتب اعتزال کو رائج کرنے میں بہت زیادہ مددومعاون ثابت ہورہے تھے۔یہاں تک کہ خلیفہ مامون خود مکتب اعتزال کے افکار اپنا چکا تھا۔عقل پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرنے کے سلسلے میں معتزلہ کے افراطی رویئے کے مقابلے میں اہل حدیث اُٹھ کھڑے ہوئے تھے جو مسائل کو سمجھنے میں عقل کی مکمل نفی کررہے تھے اور فقط نقل پر بھروسہ کرنے کو اہمیت دیتے تھے۔یہ رویہ تفریط پر مبنی تھا۔ائمہ طاہرینؑ نے اس دوران افراط وتفریط پر چلنے والے ان دونوں گروہوں کی نفی اور اُنہیں راہ اعتدال اختیار کرنے تلقین کرتے ہوئے اسلامی معاشرے کو ایک بڑی گمراہی سے بچایا۔

اس زمانے میں معتزلہ کے علاوہ کچھ لوگ زندیق اور دہری ناموں کے ساتھ عقیدتی گمراہی پھیلانے لگے تھے۔ امام باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام نے ان دونوں کے ساتھ بھی طولانی مناظرے کئے جو ہماری علمی تاریخ میں ثبت ہیں۔اس زمانے میں ایک انہی گمراہ گروہوں نے دینی عقائد ومعارف کے سلسلے میں التقاط گری کی روش پر عمل کرتے ہوئے اسلامی عقائد کو خراب کرنے کی سازش شروع کردی تھی یعنی ؛دین کے بعض عقائد کو قبول کرکے اور بعض دوسرے عقائد کی نفی کرکے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھنی شروع کردی ،دوسرے الفاظ میں جو کچھ دین میں سے اُن کا من پسند تھا اُسے لے لیا اور جو کچھ اُن کو پسند نہیں تھا اُسے چھوڑ دیا جاتا تھا۔

اسی طرح کچھ من پسند عقائد ایک دین ومذہب اُٹھائے جاتے اور کچھ دین اسلام سے لے لیا جاتا۔اسے فارسی اور عربی اصطلاح میں التقاط گری کہا جاتا ہے جو آج بھی بعض روشن خیال گروہوں میں موجود ہے۔ یہ چیز اسلامی تہذیب وتمدن کو خراب کرنے میں بہت بڑا کردار ادا کرسکتی ہے اور اس سے اسلامی عقائد کا چہرہ بگڑ سکتا ہے۔اس چیز کے خلاف ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے بہت زیادہ جہاد کیا اور علمی مناظرات کے ذریعے ایسے گروہوں کو

شکست دیکر اُن کی اسلامی معاشرے میں حوصلہ شکنی کی اور اسلامی معاشرے کو اس قسم کے خطرات سے محفوظ رکھا۔ یہ کام فقط ائمہ اہل بیتؑ ہی کر سکتے تھے چونکہ یونانی فلسفے اور دوسرے عقائد کے ترجمے کی وجہ سے بہت سے علمی مغالطات پیدا ہو رہے تھے جو نوخیز اسلامی تہذیب کے لئے بہت سخت خطرہ بن چکے تھے۔ خلفائے بنی عباس تو اس زعم میں مبتلا تھے کہ ہم علم وادب کی خدمت کر رہے ہیں، لیکن اُنہیں معلوم نہیں تھا کہ اُن کے اس عمل کی وجہ سے مسلمانوں کس کس قسم کے شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں اور دینی عقائد کن خطرات سے دوچار ہو چکے ہیں۔ یہ فقط اہل بیت اطہارؑ کا علم و فضل ہی تھا جو اسلامی معاشروں کو اس قسم کے شبہات سے بچا سکتا تھا۔

چنانچہ مامون عباسی کے دور میں امام رضا علیہ السلام نے مرو اور خراسان میں بہت سے ایسے ہی زندیق اور دہریے گروہوں کے ساتھ علمی مناظرات کر کے اُن کے پیدا کئے ہوئے شکوک و شبہات اور مغالطات کا ازالہ کیا۔ یہ درست ہے کہ یہ مناظرات مامون عباسی منعقد کراتا تھا، لیکن اس سے وہ اپنے سیاسی مفادات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ایک تو وہ اس طرح کے مناظرات کے ذریعے لوگوں کو مشغول رکھنا چاہتا تھا تاکہ وہ اس کی اسلامی مملکت کے بارے میں سیاسی خامیوں کی طرف متوجہ نہ ہو سکیں۔دوسرا وہ ان مناظرات کے ذریعے خود کو علم وادب کا مروّج ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ان مناظرات میں فلاسفہ ،زنادقہ ،صابئین اور عیسائی گروہ شرکت کرتے تھے ،جن کی وجہ سے مامون کو یہ اُمید بھی ہوتی تھی کہ کسی موقع پر امام رضا علیہ السلام سے ان گروہوں کے مقابلے میں علمی کمزوری ظاہر ہو جائے تو بھی وہ اس سے سیاسی مفاد حاصل کر سکے۔البتہ ائمہ اطہارؑ کے یہ علمی مناظرات تاریخ مسلمین کا ایک عظیم سرمایہ ہیں۔ لیکن تعصب اور اہل بیت دشمنی کی وجہ سے یہ چیزیں تاریخ کے صفحات میں دب کر رہ گئی ہیں۔

ایک اور اہم نکتہ یہ کہ رحلت رسول اللہ ﷺ کے بعد بہت سے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) مدینہ آنے شروع ہو گئے تھے تاکہ مسلمانوں کے ساتھ مناظرے کریں، لیکن خلفائے اول اور دوم اس قسم کے مناظرات پر قادر نہیں تھے لہٰذا ایسے موقعوں پر جب حضرت امام علی علیہ السلام کو خبر ہوتی اور وہ دین اسلام کو علمی میدان میں خطرات میں دیکھتے تو ان مناظرات میں حاضر ہو کر اہل کتاب کے شبہات و سوالات کا جواب دیتے۔ بعض اوقات خود خلفا حضرت امام علی علیہ السلام کو بلاتے تھے کہ وہ ان کی مشکل کشائی کریں۔بہت سی کتب حدیث میں آیا ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: ''أقضاکم علیؑ '' یعنی؛ تم میں قضاوت کے لحاظ سے سب سے زیادہ توانا علی ہیں۔ (13) چونکہ قاضی کو فقیہ بھی ہونا چاہیے لہٰذا اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت امام علی علیہ السلام سب سے بڑے فقیہ بھی تھے۔ حضرت امام علی علیہ السلام نہ فقط علمی و فقہی مسائل میں بلکہ کسی تہذیب و تمدن کی تشکیل میں ضروری تمام دوسرے شعبوں میں بھی سرفہرست ہیں۔

عسکری اور فوجی مسائل ہوں یا سیاسی مسائل ان بھی حضرت امام علی علیہ السلام او ر دوسرے ائمہ طاہرینؑ نے اقتدار سے باہر رہ کر بھی اسلامی مملکت کی بے مثال خدمات انجام دی ہیں۔ خلفائے وقت کو جب بھی اسلامی معاشرے کی بنیادیں ہلتی ہوئی نظر آئی ہیں ،اُنہوں نے اہل بیت اطہارؑ کو اپنی تمام تر دشمنی کے باوجود مدد کے لئے پکارا ہے۔ چنانچہ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے زمانے کا واقعہ ہے کہ جب امام علیہ السلام حکومتی زندان میں تھے ،ملک میں قحط شروع ہوگیا اور بارشیں بند ہو گئیں۔ مسلمان جس قدر نماز استسقاء پڑھتے تھے بارش نہیں ہوتی تھی۔اس وقت ایک عیسائی پادری میدان میں اُترا اور اس نے اسلامی معاشرے کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا اور مسلمانوں کے اعتقادات کی بنیادیں کمزور کرنی شروع کر دیں۔ یہ پادری میدان میں آیا اور اس کی دعا سے بارش شروع ہو گئی۔

اس موقعہ پر خلیفہ وقت نے مجبوراًامام حسن عسکری علیہ السلام سے مدد طلب کی۔امام علیہ السلام کو قید خانے سے آزاد کیا گیا۔امام علیہ السلام نے حکم دیا وہ عیسائی دوبارہ بارش کی دعا کے لئے اکٹھے ہوں۔ مقررہ وقت پر مسلمان اور عیسائی سب اکٹھے ہوئے۔اُس عیسائی پادری نے جب دعا کے لئے ہاتھ بلند کئے تو امام علیہ السلام نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے ہاتھ میں موجود ایک ہڈی لے لی اور فرمایا: یہ ایک نبی خدا (علیہ السلام) کی ہڈی ہے اور جب بھی کسی نبی خدا کی ہڈی آسمان کے نیچے ظاہر ہوتی ہے تو بارش شروع ہو جاتی ہے۔ یہ شخص اسی ہڈی سے فائدہ اُٹھا رہا تھا اور اس کی برکت سے

بارش برس رہی تھی۔اس طرح امام علیہ السلام نے اسلامی معاشرے کو ایک بڑے شبہے سے نجات دلائی اور اسلامی معاشرے کی بنیادوں کو محفوظ کر دیا۔(14)

ائمہ اطہار علیہم السلام کے وسیلے سے اسلامی معاشرے کو علمی اور دینی شبہات سے بچانے کا ایک اور مشہور واقعہ وہ ہے۔جو اسحاق کندی کے ساتھ منسوب ہے۔ مورخین کا بیان ہے کہ عراق کے ایک عظیم فلسفی اسحاق کندی کو یہ خبط سوار ہوا کہ قرآن مجید میں تناقض ثابت کرے اور یہ بتادے کہ قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت سے، اور ایک مضمون دوسرے مضمون سے ٹکراتا ہے اس نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے "تناقضات القرآن" نام کی ایک کتاب لکھنا شروع کی اور اس درجہ منہمک ہوگیا کہ لوگوں سے ملنا جلنا اور کہیں آنا جانا سب ترک کر دیا حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس کے خبط کو دور کرنے کا ارادہ فرمایا، آپ کا خیال تھا کہ اس پر کوئی ایسا اعتراض کر دیا جائے کہ جس کا وہ جواب نہ دے سے اور مجبوراً اپنے ارادہ سے باز آئے۔

اتفاقاً ایک دن آپ کی خدمت میں اس کا ایک شاگرد حاضر ہوا، حضرت نے اس سے فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو اسحاق کندی کو "تناقض القرآن" لکھنے سے باز رکھے۔اس نے عرض کی مولا! میں اس کا شاگرد ہوں، بھلا اس کے سامنے لب کشائی کر سکتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ اچھا یہ تو کر سکتے ہو کہ جو میں کہوں وہ اس تک پہنچادو، اس نے کہا کر سکتا ہوں، حضرت نے فرمایا کہ پہلے تو تم اس سے موانست پیدا کرو، اور اس پر اعتبار جماؤ جب وہ تم سے مانوس ہو جائے اور تمہاری بات توجہ سے سننے لگے تو اس سے کہنا کہ مجھے ایک شبہ پیدا ہو گیا ہے آپ اس کو دور فرمادیں، جب وہ کہے کہ بیان کرو تو کہنا کہ :

"ان اتاك هذا المتكلم بهذا القرآن هل يجوز مراده بما تكلم منه عن المعانى التى قد ظننتها انك ذهبتها اليها"

یعنی: اگر اس کتاب یعنی قرآن کا مالک تمہارے پاس اسے لائے تو کیا ہو سکتا ہے کہ اس کلام سے جو مطلب اس کا ہو، وہ تمہارے سمجھے ہوئے معانی و مطالب کے خلاف ہو۔

جب وہ تمہارا یہ اعتراض سنے گا تو چونکہ ذہین آدمی ہے فوراکہے گا کہ بے شک ایسا ہو سکتا ہے جب وہ یہ کہے تو تم اس سے کہنا کہ پھر کتاب "تناقض القرآن" لکھنے سے کیا فائدہ؟ کیونکہ تم اس کے جو معنی سمجھ کر اس پر اعتراض کر رہے ہو، ہو سکتا ہے کہ وہ خدائی مقصود کے خلاف ہو، ایسی صورت میں تمہاری محنت ضائع اور برباد ہو جائے گی کیونکہ تناقض تو جب ہو سکتا ہے کہ تمہارا سمجھا ہوا مطلب صحیح اور مقصود خداوندی کے مطابق ہو اور ایسا یقینی طور پر نہیں تو تناقض کہاں رہا؟

الغرض وہ شاگرد، اسحاق کندی کے پاس گیا اور اس نے امام کے بتائے ہوئے اصول پر اس سے مذکورہ سوال کیا اسحاق کندی یہ اعتراض سن کر حیران رہ گیا اور کہنے لگا کہ پھر سوال کو دہراؤ اس نے پھر اعادہ کیا۔ اسحاق تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا اور کہنے لگا کہ بے شک اس قسم کا احتمال باعتبار لغت اور بلحاظ فکر وتدبر ممکن ہے۔ پھر اپنے شاگرد کی طرف متوجہ ہوا کر بولا! میں تمہیں قسم دیتا ہوں تم مجھے صحیح صحیح بتاؤ کہ تمہیں یہ اعتراض کس نے بتایا ہے۔اس نے جواب دیا کہ میرے شفیق استاد یہ میرے ہی ذہن کی پیداوار ہے۔ اسحاق نے کہا ہرگز نہیں، یہ تمہارے جیسے شخص کے بس کی چیز نہیں ہے، تم سچ بتاؤ کہ تمہیں کس نے بتایا اور اس اعتراض کی طرف کس نے رہنمائی کی ہے۔ شاگرد نے کہا کہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے فرمایا تھا اور میں نے انھیں کے بتائے ہوئے اصول پر آپ سے سوال کیا ہے۔ اسحاق کندی بولا: اب تم نے سچ کہا ہے، ایسے اعتراضات اور ایسی اہم باتیں خاندان رسالت ہی سے برآمد ہو سکتی ہیں۔

"ثم انه دعا بالنار واحرق جميع ماكان الفه"

پھر اس نے آگ منگائی اور کتاب تناقض القرآن کا سارا مسودہ نذر آتش کر دیا۔(15)

ان تاریخی شواہد سے واضح ہوتا ہے کہ اگر اسلامی معاشرے کو علمی لحاظ سے حضرت علی اور دوسرے ائمہ طاہرین علیہم السلام جیسی مضبوط ہستیوں کی پشت پناہی حاصل نہ ہوتی تو دین اسلام بہت سی مشکلات اور شبہات کا شکار ہو جاتا اور اسلامی تہذیب و تمدن کی بنیادیں شروع سے ہی کمزور ہو جاتیں ، لیکن ائمہ طاہرینؑ کے وجود کی برکت سے مسلمان اسلامی تہذیب و تمدن کی مضبوط بنیادیں بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ چونکہ یہ بات سب پر واضح ہے کہ علمی بنیادوں کے بغیر کوئی بھی تہذیب و تمدن عرصہ دراز تک قائم نہیں رہ سکتا۔

اخلاق اور عرفان

علم اخلاق اور عرفان جیسے شعبوں میں بھی دیکھیں تو شیعہ معارف اور علوم کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آتا ہے۔ائمہ اطہار علیہم السلام کی احادیث اور روایات میں اخلاقی اور عرفانی احادیث کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ لیکن ائمہ طاہرینؑ نے ہمیشہ مخاطبین کی علمی اور فکری سطح کے مطابق احادیث بیان فرمائی ہیں۔ بعض فرامین ائمہؑ عام لوگوں کی سطح علمی و فکری کے مطابق ہیں اور بعض احادیث خواص اور گہرے ادراک کے حامل اصحاب کے سامنے بیان فرمائی گئی ہیں ۔مثلاً جو احادیث امام علی علیہ السلام نے کمیل کو مخاطب کرکے یا امام جعفر صادق علیہ السلام نے عنوان بصری کو مخاطب کرکے بیان فرمائی ہیں اُن کی علمی سطح بہت بلند ہے۔

یہی احادیث عرفان شیعہ کی بنیاد بنتی ہیں۔ائمہ طاہرین علیہم السلام کے شاگردوں نے بھی ائمہ طاہرینؑ کے فرامین کی روشنی میں بہت سی کتب اخلاق تالیف کی ہیں۔ نجاشی نے اپنی فہرست میں بہت سی ایسی کتابوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔اگر کوئی محقق فہرست نجاشی، فہرست شیخ منتجب الدین، ابن ندیم، فہرست شیخ طوسی اور معالم العلماء جیسی کتاب فہرست کی طرف رجوع کرے تو اُسے پتا چل جائے گا کہ شیعوں نے اس شعبے میں کس قدر کام کیا ہے اور اسلامی تہذیب و تمدن کو اخلاقی اور عرفانی حوالے سے کس قدر بے نیاز کر دیا ہے۔اسی طرح بعض شیعہ فلاسفہ اور عرفاء نے بھی علم اخلاق و عرفان میں حیرت انگیز کتابیں تحریر کی ہیں۔ جن میں ابن مسکویہ کی ''طہارۃ الاخلاق'' قابل ذکر ہے جو علم اخلاق کے مشہور ترین منابع میں شمار ہوتی ہے۔ خواجہ نصیرالدین طوسی کی کتاب ''اخلاق ناصری'' کا مقام بھی سب پر روشن ہے۔اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر آغا افتخار حسین لکھتے ہیں:

''اخلاقیات میں طوسی کی کتاب ''اخلاق ناصری'' ارسطو کی ''اخلاقیات'' کے بعد سب سے اہم کتاب تسلیم کی جاتی ہے''۔(16)

اصطلاحاً اخلاق کو ''حکمت عملی'' اور فسلفے کو ''حکمت نظری'' کہا جاتا ہے، شیعہ اہل بیت اطہارؑ سے میراث میں ملنے والی انہی احادیث کی وجہ سے عملی طور پر مہذّب تھے ۔تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو شیعوں کا پہلا اخلاقی دستور العمل امام علی علیہ السلام کا وہی مکتوب ہے جو آپؑ نے جنگ صفین سے واپسی پر ''حاضرین'' کے مقام پر اپنے فرزند ارجمند حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے نام لکھا تھا۔(نہج البلاغہ، مکتوب نمبر ۳۱، صبحی صالح) اسے تاریخ اسلام میں پہلے اخلاقی رسالہ کہا جاتا ہے۔اس مکتوب میں امیر المؤمنین علیہ السلام نے علم اخلاق کے تمام ابواب اور سیر و سلوک کے تمام طریقوں کو بیان فرمایا ہے اور ملکات فاضلہ کی نشاندہی کی ہے۔

اسلامی تہذیب و ثقافت میں شاہکار علمی و ادبی کتابوں میں سے ایک نہج البلاغہ ہے جو امام علی علیہ السلام کے خطبات، مکتوبات اور کلمات قصار کا مجموعہ ہے جو مسلمانوں کی علمی و ادبی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔یہ کتاب معروف شیعہ عالم سید رضیؒ نے جمع کی ہے جس میں مولا علی علیہ السلام کے فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے شاہکار کلام کو جمع کیا گیا ہے۔

دعا و مناجات کے باب میں بھی امام زین العابدین علیہ السلام کی ''صحیفہ کاملہ'' ایک ایسی شاہکار کتاب ہے جس کی وجہ سے اسلامی تہذیب و تمدن جس قدر فخر کرے کم ہے چونکہ دعا اور مناجات کے سلسلے میں اس سے اہم اور بڑا مجموعہ کہیں اور نہیں ملتا۔کتاب صحیفہ کاملہ آپؑ کی دعاؤں کا مجموعہ ہے اس میں بے شمار علوم و فنون کے جوہر موجود ہیں یہ پہلی صدی کی تصنیف ہے۔(17) اسے علماء اسلام نے زبور آل محمد اور انجیل اہلبیت کہا ہے (ینابیع

المودۃ ص ۴۹۹ ، فہرست کتب خانہ طہران ص ۳٦) ۔ اوراس کی فصاحت وبلاغت معانی کو دیکھ کراسے کتب سماویہ اور صحف الٰہیہ وعرشیہ کادرجہ دیاگیاہے (ریاض السالکین ص ا) اس کی چالیس شرحیں ہیں جن میں ریاض السالکین کو فوقیت حاصل ہے۔

اس کے علاوہ شیعہ علمانے اخلاقیات اور عرفانیات کے باب میں اہم آثار چھوڑے ہیں اُن میں اصول کافی ثقۃالاسلام کلینی، تحف العقول ابن شعبہ حرّانی، الخصال شیخ صدوق، مصابیح القلوب ابو علی بیہقی شیعی، الاداب الدّینیۃ شیخ طبرسی، مکارم الاخلاق شیخ ابو منصور طبرسی، ارشاد القلوب دیلمی، عیون الحکم والمواعظ شیخ علی بن محمّد لیثی واسطی، تنبیہ الخواطر شیخ ابوالحسن ورّام، وسائل الشّیعہ شیخ حرّ عاملی (کتاب العِشرہ)، بحارالانوار مجلسی (جلد ۷٦،۷۷) وسراج الشّیعہ فی آداب الشّریعہ شیخ عبداللہ مامقانی ایسی اخلاقی کتابیں ہیں جو ائمہ اطہار ہی کی پیروی میں لکھی گئی ہیں۔(18)

یہ انہی کتب کااثر تھاکہ جہاں جہاں شیعہ نےاپنے اسلاف کے علوم ومعارف سے کی حفاظت کی ہے اور علم سے تمسک رکھاہے ،اُن پر اسلامی اخلاق وعرفان حاکم رہاہے۔بعض تاریخی شواہد سے پتا چلتاہے کہ شیعہ اپنے اپنے علاقوں میں انہی کتابوں کی وجہ سے پابند شریعت رہے ہیں اور اخلاقی اعتبار سے بھی انتہائی مہذب اور دوسروں سے ممتاز زندگی گذارتے رہے ہیں۔قزوینی اپنی کتاب آثار البلاد واخبار العباد میں لکھتاہے کہ مدائن کے لوگ شیعہ امامیہ ہیں ان کے شہر میں عورتیں دن کے وقت بازاروں میں نہیں آتیں۔

فلسفہ و کلام

علم کلام کا تعلق اسلامی عقائد سے ہے جس کی تعریف میں کہا جاتا ہے؛ یہ ایسا علم ہے جس کے ذریعے اسلام کے مختلف پہلوؤں کا دفاع کیا جاتا ہے۔یعنی اس کے ذریعے انسان میں اسلامی اعتقادات کا دفاع کرنے اور اسلام کے بارے میں شبہات کا جواب دینے کی قدرت پیدا ہوجاتی ہے۔علم کلام کا تعلق اعتقادات (معرفت خدا، نبوت وغیرہ) سے ہے،اس لئے ائمہ اطہار علیہم السلام کے زمانے میں شیعوں کواس لحاظ سے کوئی مشکل نہیں تھی چونکہ وہ اپنے اعتقادی مسائل براہ راست ائمہ اطہارؑ سے سیکھ لیتے تھے یا جن علاقوں میں ائمہؑ نہیں تھے وہاں ائمہ اطہارؑ کے شاگرد شیعوں کے کلامی واعتقادی سوالات کے جواب دیتے تھے۔گمراہ کن عقائد کا مقابلہ کرنے اور مختلف مذاہب اور ادیان کے پیروکاروں کے ساتھ بحث مباحثہ کرنے کے سلسلے میں بھی ائمہ اطہارؑ اور اُن کے پرورش یافتہ شاگرد پیش قدم تھے۔ائمہ اطہارؑ نے تمام مسالک اور مذاہب کے ساتھ جو مناظرات اور علمی مباحثے کئے ہیں وہ تاریخ میں محفوظ ہیں۔جیساکہ امام جعفر صادق علیہ السلام کاابن ابی العوجاء کے ساتھ مناظرہ اور امام رضا علیہ السلام کامختلف ادیان کے علماء کے ساتھ بحث ومباحثہ قابل ذکر ہے۔ائمہ اہل بیتؑ اور اُن کے پرورش یافتہ شاگردوں کا یہی علمی کارنامہ ہے کہ جس کی وجہ سے اسلامی معاشرہ گمراہ کن عقائد سے محفوظ رہاہے۔(احتجاج طبرسی میں یہ مناظرات دیکھے جاسکتے ہیں)

اسلامی معاشرے کو اعتقادی حوالے سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں ائمہ طاہرینؑ نے بہت زیادہ جدوجہد کی ہے اور اپنے حلقہ درس میں ایسے ایسے شاگرد تیار کئے ہیں جنہوں نے تمام اسلامی علاقوں میں اسلامی اعتقادات کا سخت دفاع کیاہے۔اس سلسلے میں ہشام بن حکم وہ معروف شیعہ متکلم ہیں جن کے کلامی مباحث کوتاریخ ہمیشہ یادرکھے گی۔یہ روایت مشہور ہے کہ جب ہشام بن حکم جوان تھے، منیٰ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے حلقہ درس میں حاضر ہوئے تو امام علیہ السلام نے ان کا بہت احترام کیا۔لوگوں نے امامؑ کی جانب سے ہشام کے احترام کا سبب دریافت کیاتو امام علیہ السلام نے ہشام کے مقام ومرتبے کومزید واضح کرنے کے لئے فرمایا:

اے ہشام! عمرو بن عبید کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا وہ بیان کرو۔ہشام نے عرض کی یاابن رسول اللہ ﷺ میں آپ کے سامنے شرم محسوس کرتا ہوں (کہ اپنی تعریف کروں) امام علیہ السلام نے فرمایا: میں خود تمہیں یہ واقعہ بیان کرنے کاحکم دیتاہوں۔تب ہشام نے یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔وہ کہتے ہیں: میں جب بصرہ گیاتو عمرو بن عبید کے حلقہ درس میں حاضر ہوا۔وہ کہہ رہے تھے: امام کے وجود کی کوئی ضرورت نہیں۔درس

کے بعد جب شاگرد اپنے اپنے سوالات کر رہے تھے۔ میں نے کہا میں بھی ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ عمرو بن عبید نے کہا: پوچھو! میں نے کہا: کیا آپ کی آنکھ ہے ؟اُس نے کہا: یہ کیسا سوال ہے ؟میں نے کہا: ہاں یہ بھی ایک سوال ہے۔اُس نے کہا: ہاں میری آنکھ ہے۔

میں نے کہا: کیا آپ کے کان بھی ہیں؟ اس نے کہا: ہاں۔ میں نے کہا: اُن کے ساتھ کیا کرتے ہو؟ اس نے کہا: سنتا ہوں (اسی طرح ہشام نے بدن کے ایک ایک عضو کے بارے پوچھا۔ جس کے جواب مین عمرو بن عبید مثبت جواب دیتا ہے۔آخر میں ہشام نے پوچھا: کیا تمہار قلب (دل) بھی ہے یہاں نہیں ؟اس نے کہا: ہاں میرا قلب بھی ہے۔ہشام نے کہا: اس سے کیا کام انجام دیتے ہو؟ اس نے کہا: کوئی خاص کام انجام نہیں دیتا، لیکن میرے بدن کے تمام کام قلب کے ساتھ ہی وابستہ ہیں۔اگر قلب نہ ہو تو آنکھ دیکھ نہیں سکتی، کان سن نہیں سکتے اور دوسرے اعضائے بدن کام نہیں کر سکتے۔ قلب اُن کے کاموں کی تصحیح کرتا ہے۔ہشام نے کہا: پس کیا مملکت بدن کو قلب کی ضرورت ہے، لیکن معاشرے کو امام کی ضرورت نہیں ؟عمرو بن عبید نے کہا: میرے خیال میں تو ہشام بن حکم ہے۔

ہشام بن حکم، ہشام بن سالم اور مؤمن طاق جیسے ائمہ اطہارؑ کے شاگرد علم کلام میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور اُنہوں نے اسلامی معاشرے کی بہت زیادہ خدمات انجام دی ہیں اور اسلامی معاشرے کو خطرناک کلامی و علمی شبہات سے بچایا ہے۔ فہرست نجاشی کے مطابق فقط ہشام بن حکم نے تیس جلدیں کتابیں علم کلام میں لکھی ہیں۔ بنابریں شیعوں کو ائمہ اطہار علیہم السلام کے زمانے میں اعتقادی اور کلامی حوالے سے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ لیکن غیبت کبریٰ کے بعد شیعوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے لہٰذا علمائے شیعہ نے اس سلسلے میں اہم اقدامات کرنے ضروری سمجھے۔اس لئے اس دور میں علم کلام میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔

منجملہ جن لوگوں نے زمانہ غیبت میں اس سلسلے میں پیش قدمی کی ہے وہ آل نوبخت تھے۔ نوبختی ایک شیعہ اور ایرانی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ فضل بن شاذان نے بھی اس سلسلے میں کتاب لکھی ہے۔اس کے بعد شیخ مفیدؒ نے علم کلام میں بہت زیادہ کام کیا ہے۔اسی طرح شیخ مفید ہی کے دور میں شیخ طوسی اور سید مرتضیٰ علم الھدیٰ کا دور کلام شیعہ کے عروج کا زمانہ کہلاتا ہے۔ یہ لوگ چوتھی صدی ہجری میں گذرے ہیں۔ یہ وہ زمانہ جب بغداد میں مذاہب وادیان کے درمیان بحث مباحثوں کا بازار گرم تھا۔انہی شیعہ بزرگوں اور ان کے شاگردوں نے ان دو صدیوں میں علم کلام کی ترویج میں بہت زیادہ کام کئے ہیں۔ سید مرتضیٰ علم الھدیؒ نے سب سے زیادہ کلامی کتابیں لکھی ہیں۔ کلامی حوالے سے اسلامی تہذیب وتمدن کو شیعہ متکلمین نے بہت زیادہ رونق بخشی ہے۔علامہ حلیؒ جو آٹھویں صدی میں گذرے ہیں، سب سے بڑے شیعہ متکلم سمجھے جاتے ہیں، اُنہوں نے تقریباً ۴۲ کتابیں علم کلام میں لکھی ہیں۔

اسی طرح خواجہ نصیر الدین طوسیؒ نے بھی کلام اور فلسفہ میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ جن کے کام دوست ودشمن نے سراہا ہے اور اُن کی اسلامی تہذیب میں خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ نصیر الدین طوسی کا شمار اپنے زمانے کے علم وادب کے بزرگ دانشوروں میں ہوتا ہے۔ سلطان الحکماء خواجہ نصیر الدین اپنے بچپن اور جوانی کے سالوں میں تحصیل علم اور کسب معارف کے لئے بے حد ذوق وشوق کا اظہار کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی جوانی میں مختلف علوم میں مثلاً حکمت، ریاضی اور علم نجوم میں بڑی شہرت حاصل کر لی تھی۔ ابتدائی علوم کی تکمیل کے کچھ ہی عرصے کے بعد اپنے مطالعات کی تکمیل اور اپنی معلومات کی توسیع کے لئے نیشاپور چلے گئے۔

نیشاپور خراسان کے چار بڑے شہروں (مرو، بلخ، ہراشا، نیشاپور) میں سے ایک شہر تھا اور سالہا سال شاہان ظاہریان وغیرہ کا پایہ تخت رہ چکا تھا۔ عرصہ دراز سے علم و دانش کا مرکز تھا اور اپنے دامن میں بہت سے علمائے ایران کی پرورش کر چکا تھا۔ اگرچہ وہ کئی بار حملوں کا شکار بھی ہوا خصوصاً قبیلہ ''غز'' جس نے بڑی تباہی مچائی تھی اور شہر کے اکثر مدارس، مساجد، کتاب خانے ویران ہو گئے تھے پھر بھی مغلوں کے حملہ سے قبل تک نیشاپور علمی اہمیت کا حامل تھا مگر اس وحشی قوم کے حملہ سے کھنڈرات میں بدل گیا۔ جس وقت مغلوں نے نیشاپور پر حملہ کیا تو لوگوں کے قتل عام

سے پہلے خواجہ شہر سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئے اور بیابانوں میں مارے مارے پھرتے رہے۔جب اسماعیلیان کوخواجہ کی اس بے سروسامانی کاعلم ہوا توانھوں نے خواجہ کی جستجو کی اورانہیں اپنے پاس لے گئے ۔ ان کے علم ودانش اور فضیلت کی وجہ سے اسماعیلیان، خواجہ کی بے حد عزت وتکریم کرتے تھے، خواجہ وہاں جنگ وجدال کے ہنگاموں سے بے فکر اورآسودہ خاطر ہو کر مطالعہ اور تالیف وترجمہ میں سرگرم ہوگئے۔

مغلوں کا حملہ

۶۵۱ہجری میں مغلوں کے شہنشاہ منکوقآن نے اپنے چھوٹے بھائی ہلاکو کوایک بھاری فوج دے کر بھیجاکہ اسماعیلیان کے قلعوں پر قبضہ کرلے۔ اسماعیلیان کے بادشاہ خورشاہ نے خواجہ نصیرالدین سے اس معاملے میں صلاح مشورہ کیاکہ ہلاکوخان کے بارے میں کیاکیاجائے؟ خواجہ نے کہاکہ اس طوفان کے سامنے کھڑا ہونا اوراس کامقابلہ کرنالاحاصل ہے، اس سے لوگوں کو قتل عام ہوگا تمام تہذیبی وثقافتی ثمرات نذرآتش ہوجائیں گے اور بہت تباہی اور بربادی ہوگی۔

خورشاہ نے خواجہ نصیرالدین کی رائے کوپسند کیااوراس نے ایک وفد تیار کیاجس میں اس کابیٹا، بھائی چندایک دانشور اور سردارشامل تھے اوراس وفد کوبہت سے قیمتی تحائف دے ہلاکوکے پاس بھیجا۔ وفدکارئیس خواجہ نصیرالدین تھا۔ خواجہ نے ہلاکوکے سامنے اس قدر سنجیدہ اور محکم باتیں کیں کہ ہلاکوکی تیزاور سرکش طبیعت کورام کرلیااوراس طرح اس نے اپنی عقلمندی سے ایک ہولناک فتنے کاسدباب کردیا۔ خورشاہ قلعہ سے باہرآیا اورہلاکوکے سامنے زمین کوبوسہ دیا۔ہلاکونے جس کوخواجہ کی دانش عقل مندی اور فہم وفراست کی خبر تھی اس کی عزت افزائی کی۔

عظیم الشان لائبریری کی تاسیس

خواجہ نصیرالدین نے اپنی تمام کتابوں اور علمی اوزاروں کوتاخت وتاراج اور نذرآتش ہونے سے بچا لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ان ساری چیزوں کواکٹھاکیااور مراغہ میں ایک لائیبریری قائم کی جس میں ۴۰۰۰۰۰کتابیں موجود تھیں۔ہلاکو نے مراغہ میں ایک عظیم الشان رصدگاہ تعمیر کرنے کا رادہ کیا اوراس کام کے لئے اس نے جمال الدین زبیدی بخاری کو بلایا تھا، مگر بخاری نے اسے یہ جواب دیا تھاکہ یہ کام صرف خواجہ نصیرالدین ہی کرسکتاہے جواس وقت اسماعیلیان کے قلعے میں مقیم ہے۔لہٰذاہلاکونے اس کام پر خواجہ نصیرالدین طوسی کو مامور کیا۔

رصدگاہ کی تاسیس

خواجہ نصیرنے مراغہ میں اس موقع کوغنیمت جانااورہلاکو کوترغیب دی کہ رصدگاہ مراغہ (تبریز) میں تعمیر کی جائے اور ساتھ ہی وہ خود اپنے مرغوب خاطر کام میں مصروف ہوجائے چنانچہ خواجہ نصیرالدین علم ودانش کے دامن کووسیع تر کرنے کے لئے ہلاکوکی نظر موافقت کودیکھتے ہوئے کچھ مشہوراور نامور منجمین کی مدد سے مراغہ کے شہر میں رصدگاہ کی بنیاد ڈالنے کی سرگرمیوں میں مصروف عمل ہوگئےاوراس کے لئے آلات اور ضروری سازوسامان فراہم کرنے لگے۔

خواجہ دانشوروں کی کتابوں فضلاء اور متقدمین کے آثار کو حتیٰ کہ اپنے معاصرین کی تصنیفات کو بھی بڑی توجہ اور شوق سے پڑھتے تھے وہ دنیوی لذات کوبلائے طاق رکھ کر علماء کی کتابوں پر غور وفکر کرتے تھے اوران کاگہرا مطالعہ فرماتے تھے اوران میں روحانی لذت اور ذہنی سرور وکیف محسوس کرتے تھے جیساکہ فرماتے ہیں:

لذت دنیوی همه هیچ است نزد من

در خاطر از تغیر آن هیچ ترس نیست

روز تنعم و شب عیش و طرب مرا

غیر از شب مطالعه و روز درس نیست

یعنی: "میرے نزدیک دنیا کی تمام لذتیں بے وقعت ہیں اور میرے دل میں دنیاوی نعمتوں کے چلے جانے کا کوئی خوف و خطر نہیں ہے۔ میرے لیے تو دن کے مزے اور رات کا طرب، رات کے مطالعہ اور دن کے درس و تدریس میں پوشیدہ ہے۔"

اپنی اسی ذاتی اور فطری صفت کی بناء پر بہت تھوڑی مدت میں ایک ایسی لائبریری تیار کرلی جس میں ۴۰۰۰۰۰ عمدہ کتابیں موجود تھیں۔ وہ ہمیشہ اس کتب خانے میں تحقیقی اور مطالعاتی کاموں میں مشغول رہتے اور تشنگان علم وادب اپنی پیاس بجھاتے۔

خواجہ نصیرالدین طوسی کے مصائب

خواجہ اُن علمی شخصیات میں سے ہیں جنہوں نے علم و معرفت کے راستے میں بے شمار مصائب و مشکلات برداشت کی ہیں۔ خواجہ مسلمانوں کی علمی دنیا میں محقق کے نام سے مشہور تھے اور دوست و دشمن اُن کے علم کا معترف ہے لیکن اس کے باوجود اس نابغۂ دہر شخصیت کو اپنوں ہی کی جانب سے بے پناہ مصیبتیں دیکھنی پڑیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر آغا افتخار حسین سلطنت بغداد کے واقعات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"پھر ایک ایسا دور بھی آیا جب اسی بغداد میں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جس میں ایک حاکم نے ایک جید عالم اور سائنس دان کو معقول وجہ کے بغیر قید کردیا اور پندرہ سال تک یہ دانشور قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرتا رہا۔ یہ عظیم انسان محقق خواجہ نصیرالدین طوسیؒ تھا۔۔۔ چودہ سو سال کی تہذیب کی تاریخ میں مسلمانوں میں متعدد عالم، دانشور اور سائنس دان پیدا ہوئے ہیں لیکن محقق کا خطاب مسلمانوں نے صرف دو ہی فضلا کو دیا۔ پہلے محقق طوسی کو اس کے بعد محقق دوانی کو"۔ (19)

ڈاکٹر آغا افتخار حسین محقق طوسی کی علمی خدمات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس طرح پندرہ سال تک یہ عظیم محقق زندان میں اسیر رہا۔ اس اسیری کے دوران طوسی نے بوعلی سینا کی کی مشہور تصنیف ''اشارات'' کی شرح لکھی جو یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھی مقبول ہوئی۔ اس شرح کے خاتمے پر طوسی نے اپنی اسیری کے مصائب کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ زمانۂ قدیم میں اہل علم پر جو مظالم کئے گئے وہ میں نے خود نہیں دیکھے لیکن آلام و مصائب کے جو پہاڑ مجھ پر توڑے جارہے ہیں وہ قیاس انسانی سے باہر ہیں"۔

جب ہلاکو خان کے حکم سے مراغہ (تبریز) میں ایک رصدگاہ قائم کی گئی جس کا انتظام محقق طوسی کے سپرد کیا گیا، اور اس طرح علم ہیئت میں تحقیق کے ایک ایسے دور کی ابتدا ہوئی جس کے اثرات صدیوں تک یورپ کے ہیئت دانوں اور ریاضی دانوں کی تحقیقات میں ملتے ہیں۔ مراغہ کی رصدگاہ سائنس کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔۔۔ یورپ کے ریاضی دانوں اور ماہرین علم ہیئت نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ اس رصدگاہ میں اجرام فلکی کے مشاہدے، نیز ریاضی اور اقلیدس کے مسائل حل کرنے کے لئے ایسے آلات استعمال ہوتے تھے جو یورپ میں کئی صدیوں بعد کوپرنیکس وغیرہ کے زمانے تک ناپید تھے اس رصدگاہ میں محقق طوسی نے ریاضی کے ایسے مسائل پر مقالے لکھے جن پر عرصے تک اہل یورپ کی نظر نہیں گئی تھی۔ (20)

چنانچہ اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''اصول اقلیدس'' میں طوسی نے خطوط متواتر کے مصادر کا نظریہ پیش کیا جس پر پانچ صدیوں تک یورپ کے ریاضی دان بحث کرتے رہے۔ اسی بناپر محقق طوسی نے پہلی بار ''علم المثلثات الکرویہ'' کو مستقل حیثیت دی اور اس طرح ایک کتاب ''شکل القطاع

''لکھی جس کے ذریعے ٹرائی گونومیٹری کی بنیادیں استوار ہوئیں جو جدید ریاضی کے نصف سے زیادہ حصے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر آغا افتخار حسین مزید لکھتے ہیں:

"ریاضی ،ہیئت اور اقلیدس وغیرہ کے علاوہ اخلاقیات اور فلسفے میں بھی طوسی نے بیش بہا کارنامے انجام دیے ہیں۔بوعلی سینا کے ''اشارات'' کی شرح کا ذکر ہو چکا ہے۔طوسی کی شرح پر متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں جن سے منطق میں نئے زاویے پیدا ہوتے ہیں۔ اخلاقیات میں طوسی کی ''اخلاق ناصری'' ارسطو کی اخلاقیات کے بعد سب سے اہم کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔(یورپ کے فلسفیوں نے اخلاقیات کے فلسفے پر دو صدی بعد توجہ دی)۔فلسفے اور علم کلام میں ایک نہایت عظیم تصنیف ''تجرید الکلام والعقائد'' (تجرید طوسی) ہے۔"

اس کتاب (تجرید الکلام والعقائد) کی معنوی حیثیت اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں محقق طوسی نے اسلامی افکار کی شیرازہ بندی کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کتاب میں جوہر وعرض ،اجسام ،وجود وعدم ،علت ومعلول اور اعراض وغیرہ کے موضوعات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ان بحثوں کی روشنی میں اسلامی افکار کے چار فکری مکاتب یعنی متکلمین ،صوفیہ ،مشائیہ اور اشراقین کا جائزہ لے کر ان مختلف عقائد و نظریات کو ایک رشتے میں منسلک کرنے کی کوشش کی ہے۔(21)

تاریخ

اسلامی علوم کی ایک شاخ تاریخ ہے جس میں شیعوں کے کردار کو دیکھا جائے تو بظاہر شیعیت گوشہ نشین نظر آتی ہے۔شیعوں کے بہت سے تاریخی آثار خود سر حکمرانوں کی طرف سے مصائب ومشکلات کی وجہ سے ضائع ہو چکے ہیں۔پھر بھی فہرست ابن ندیم اور فہرست نجاشی جیسی کتب میں شیعوں کی تاریخی کتب نمایاں طور پر نظر آتی ہیں جو خاص تاریخی حوالوں کے لحاظ سے اہم ترین تاریخی کتب سمجھی جاتی ہیں۔مثلاً صفین ،جمل اور واقعۂ کربلا کے بارے میں شیعوں نے بہت سی تاریخی کتب لکھی ہیں۔شیعوں کا تاریخ کے بارے میں یہ اہتمام ،تاریخ کے بارے میں اُن کی دینی بصیرت کو ظاہر کرتا ہے۔چونکہ شیعوں نے قرآن مجید اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی تعلیمات کی روشنی میں تاریخ کو ہمیشہ ''عبرت'' کے عنوان سے لیا ہے۔"لَقَدْ کَانَ فِی قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِی الأَبْصَار"۔(22)

شیعوں کے نزدیک تاریخ سرچشمۂ معرفت ہے اور وہ اسے عبرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یہی شیعوں کی تاریخ میں دلچسپی کا سبب بنتی ہے۔دوسری طرف شیعوں کے امام اول حضرت علی علیہ السلام نے بھی شیعوں کو تاریخ اور تاریخی واقعات سے تفنن طبع کے بجائے عبرت حاصل کرنے کی وصیت کی ہے۔ چنانچہ نہج البلاغہ کے مکتوب نمبر ۳۱ میں مولا امیر المؤمنینؑ اپنے فرزند دلبند حضرت امام حسن علیہ السلام کو وصیت کرتے ہوئے ایک جگہ فرماتے ہیں:

''اے فرزند !اگرچہ میں نے اتنی عمر نہیں پائی جتنی اگلے لوگوں کی ہوا کرتی تھیں ،پھر بھی میں نے اُن کی کارگزاریوں کو دیکھا ہے ،اُن کے حالات وواقعات میں غور کیا ہے اور اُن کے چھوڑے ہوئے نشانات میں سیر وسیاحت کی ،یہاں تک کہ گویا میں بھی انہی میں کا ایک ہو چکا ہوں۔بلکہ اُن سب کے حالات ومعلومات جو مجھ تک پہنچ گئے ہیں ،اُن کی وجہ سے ایسا ہے کہ گویا میں نے اُن کے اول سے لے کر آخر تک کے ساتھ زندگی گذاری ہے''۔(23)

تاریخ کے بارے میں حضرت امام علی علیہ السلام کا یہ بیان شیعوں کو تاریخی بصیرت عطا کرتا ہے جس کے بعد وہ تاریخ کا بطور عبرت مطالعہ کرتے ہیں۔جس کی وجہ سے شیعوں نے تاریخ نگاری کے باب میں بہت بلند قدم اُٹھائے ہیں۔اگر ہم غیر امامی شیعوں کو بھی شامل کریں تو شیعوں کی تاریخی کتب کی فہرست اور بھی وسیع ہو جاتی ہے۔

مشہور ہے کہ سب سے بڑے مؤرخ اور سیرت نگار ''ابن اسحاق '' شیعہ تھے۔بہت سے قرائن بھی اس بات پر موجود ہیں۔جیسا کہ ابن ہشام نے ابن اسحاق سے روایت لیتے وقت بہت سی باتیں حذف کردی ہیں جو اس دعویٰ کی دلیل ہے،چونکہ محققین کے مطابق ابن ہشام نے، ابن اسحاق سے نقل کرنے میں جن باتوں سے پرہیز کیا ہے وہ اہل بیت اطہار علیہم السلام کے بارے میں تھیں۔ابن اسحاق کے بعد ائمہ اہل بیتؑ کے جن اصحاب نے تاریخ کے خاص حالات لکھے ہیں،اُن میں لوط بن یحییٰ المعروف ابی مخنف اور اُن کے بعد واقدی،یعقوبی اور مسعودی ہیں۔البتہ یہ لوگ اصطلاحاً امامی مذہب نہیں ہیں بلکہ محبت اہل بیتؑ رکھنے کی وجہ سے شیعہ مشہور ہیں اور ان کی کتابوں میں اہل بیتؑ کی مخالفت کے بارے میں کوئی بات نہیں ملتی۔اس لحاظ سے انہی شیعی مؤرخ کے عنوان سے پہنچانا جاسکتا ہے۔جیسا کہ اہل بیت مخالف متعصب علما بھی اسی خیال کا اظہار کرتے ہیں۔البتہ شیعوں کے لئے تاریخ نگاری کی مشکلات بھی بہت زیادہ تھیں،جو ایک الگ تحقیق طلب موضوع ہے۔ان سب مشکلات کے باوجود شیعوں کو اپنے نمایاں عقائد اور سیاسی مؤقف کی وجہ سے اسلامی تہذیب و تمدن کی تاریخ لکھنے والے نظر انداز نہیں کرسکتے۔

حوالہ جات

1۔ خامنہ ای ڈاٹ آئی آر

2۔ جاحظ نے عثمانیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جس میں اس گروہ کے بارے میں تفصیلات موجود ہیں۔

3۔ شیخ مفید، الارشاد، ص ۲۷۱

4۔ طوسی، اختیار معرفۃ الرجال، تحقیق حسن مصطفوی، ص ۲۷۸، ۲۷۵ / شیخ محمّد تقی شوشتری، قاموس الرّجال، ج ۳، ص ۴۱۶

5۔ شیخ ابراہیم نصر اللہ، حلب والتشیع، ص ۲۴، ۲۱

6۔ علی اصغر فقیہی، آل بویہ، ص ۴۶۷، ۴۸۹

7۔ علی اصغر فقہی، آل بویہ، ص ۴۵۷

8۔ جاڑا حسین بخش، مقدمہ تفسیر انوار النجف، ص ۱۵۱

9۔ سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، ج ۲، ص ۳۲۸ طبقات المفسرین

10۔ مسند احمد حنبل، ج ۱، ص ۱۱۹/ سیّد عبدالحسین شرف الدّین، مؤلّفوا الشّیعہ فی صدر الاسلام، ص ۱۵، ۱۴۔

11۔ نجاشی، فہرست مصنفی الشیعۃ، ص ۴

12۔ شیخ مفید، الاختصاص، ص ۵۳/ مجلسی، بحار الانوار، ج ۴۶، ص ۳۲۸

13۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۱، ص ۱۸

14۔ شبلنجی، نور الابصار، ص ۱۶۷/ ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۴۲۵/ علی بن عیسی اربلی، کشف الغمّۃ، ج ۳، ص ۲۱۹/ ابن حجر ہیثمی، الصواعق۔المحرقہ، ص ۲۰۷، ابن صبّاغ مالکی، الفصول المہمّۃ، ص ۳۰۴

15۔ مناقب ابن شہر آشوب مازندرانی جلد ۵ ص ۱۲۷، بحار الانوار جلد ۱۲ ص ۱۷۲، دمعہ ساکبہ جلد ۳ ص ۱۸۳

16۔ آغا افتخار حسین، قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ، ص ۳۷

17۔ معالم العلماء ص ۱، طبع ایران

18۔ سید حسن صدر، تاسیس الشیعہ لعلوم الاسلام، ص ۴۰۴/ محمد رضا حکیمی، دانش مسلمین، ص ۳۲۳۔

19۔ آغا افتخار حسین، قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ، ص ۳۴، ۳۳

20۔آغا افتخار حسین، قوموں کی شکست وزوال کے اسباب کا مطالعہ، ص ۳۷،۳٦

21۔ایضاً

22۔یوسف: آیت ۱۱۱

23۔نہج البلاغہ، مکتوب نمبر ۳۱، ترجمہ مفتی جعفر حسینؒ۔